برصغیر کا ہندو مسلم تنازع۔ کیا کوئی مثبت آپشن موجود ہے؟

ارشاد احمد حقانی

آج میں ایک اہم اور حساس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے والا ہوں۔

سیفما کے سیکرٹری جنرل اور میرے عزیز دوست جناب امتیاز عالم کا عرصے سے معمول رہا ہے کہ جب وہ دفتر آتے تو سب سے پہلے میرے کمرے میں تشریف لاتے اور چائے کی پیالی پر گپ شپ ہوتی۔ وہ مجھے کہتے کہ مجھے دفتر آنے میں سب سے بڑی دلچسپی یہی ہوتی ہے کہ آپ کے ساتھ ایک نشست ہو جاتی ہے۔ سالوں پر پھیلی ان نشستوں کے دوران کوئی دس بارہ برس پہلے میں نے ان سے کہا کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک تجویز ہے، لیکن میں ابھی حالات کو اس قدر سازگار نہیں سمجھتا کہ اس کو لکھ ڈالوں۔ میں نے انھیں اپنی تجویز کے خدوخال بھی بتائے لیکن خوفِ فسادِ خلق سے یہ تجویز اب تک ناگفتنی ہی رہی تھی۔ مگر اب حالات میں کچھ ایسی تبدیلی آئی ہے کہ اس تجویز کو لکھ دینے سے کوئی بڑا طوفان آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان میں جو بے چینی پیدا ہوئی وہ مجیب الرحمٰن کے چھے نکات کی صورت میں ڈھل چکی تھی۔ انہی دنوں لاہور میں مغربی پاکستان کے چوٹی کے تقریباً تمام سیاست دانوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کا اہتمام حسب معمول نواب زادہ نصر اللہ خان نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں ملک کی تازہ ترین صورت حال پر، مشرقی پاکستان کی بے چینی کے پس منظر میں تفصیلی غور وخوض کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی اس کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ انھوں نے کانفرنس کے اکابر کے سامنے اپنا چھے نکاتی فارمولا پیش کیا جسے پوری کانفرنس نے اتفاق رائے سے قطعی طور پر مسترد اور ناقابل قبول قرار دیا۔ چودھری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان اس کانفرنس کے بعد بھی کچھ دیر کے لیے لاہور میں رکے۔ وہ عام طور پر گرمی اور سردی کے حوالے سے معتدل موسم کراچی اور لاہور میں گزارتے تھے۔ یہ دن ان کے لاہور میں ٹھہرنے کے تھے، میں نے ارادہ کیا کہ ان کی زیارت کی جائے۔ ان دنوں وہ ایک باریش بزرگ بن چکے تھے۔ میرے ساتھ میرے محترم بھائی اور ممتاز صحافی جناب مصطفیٰ صادق بھی چودھری صاحب سے ملنے گئے۔ راستے میں، میں نے مصطفیٰ صادق صاحب کو بتایا کہ آج میرا ارادہ چودھری صاحب سے ایک تجویز پر گفتگو کرنے کا ہے جس پر تجویز کی نوعیت جان کر مصطفیٰ صادق نے مجھے کہا کہ آپ چودھری صاحب سے اس موضوع پر بات نہ کریں لیکن میں مشرقی پاکستان

کی صورتحال اور پاک ہند تعلقات کی کشیدگی کی وجہ سے اپنی تجویز پر بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ چودھری صاحب نے اپنی ابتدائی گفتگو میں کہا کہ وہ مشرقی پاکستان کے حالات سے انتہائی پریشان اور متفکر ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ تو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وجہ نزاع تھا ہی اور اسی کی وجہ سے ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی تھی۔ میں نے چودھری صاحب سے کہا کہ اس سیاق وسباق میں کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم ہندوستان سے اپنے تعلقات کو کوئی نئی شکل دینے کی کوشش کریں۔ دوسرے لفظوں میں کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم دونوں ملکوں کے تعلقات کو Reinvent کریں۔ اس کی میں نے ایک عملی شکل بھی تجویز کی، جسے سن کر چودھری صاحب نے فرمایا کہ ایسا کرنے سے پاکستان اپنی موجودہ شکل میں قائم نہیں رہے گا۔ میں نے ان کے احترام کی وجہ سے ان سے مزید بحث نہ کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن تجویز میرے ذہن میں موجود رہی۔ پاکستان میں چونکہ ایک اچھا خاصا حلقہ ہندوستان سے کسی بھی قسم کے ہمہ جہتی اچھے تعلقات رکھنے کا حامی نہیں ہے، اس لیے میں نے بھی اس موضوع کو نہ چھیڑنا ہی مناسب سمجھا، لیکن اب اہم صحافتی حلقے ہندوستان سے نئے تعلقات کے سوال پر کچھ کچھ غور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۴/ مارچ ۲۰۰۷ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے ہندوستان کے ایک مقبول اور بڑی اشاعت رکھنے والے انگریزی ہفت روزے ''انڈیا ٹوڈے'' کے جلسے میں شرکت کی تھی جو نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر شہید محترمہ نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا پاک ہند تعلقات کو نئے سرے سے ''ایجاد'' کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے انھوں نے Reinvent کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ ان ابتدائی کلمات اور ہندوستانی وزیراعظم راجیو گاندھی کو تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں سارک کو ایک ثقافتی تنظیم کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی تنظیم بھی بنانا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۹۹ء میں ہونے والی انڈو پاک پارلیمنٹرین کانفرنس کا حوالہ دیا تھا جس میں انھوں نے شرکت کی تھی اور دونوں ملکوں کے پارلیمانی ممبران کے سامنے یہ بات رکھی تھی کہ پاکستان، ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے تمام ملکوں کو اپنے اختلافات اور آپس کے قضیوں کو فی الحال ایک طرف رکھتے ہوئے ایک مشترکہ منڈی قائم کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنے خطے سے غربت، بھوک، بیروزگاری اور بچھڑے پن کا خاتمہ اپنی نرم سرحدوں کے ذریعے کر سکیں۔

ادھر میاں نواز شریف بھی یہ تجویز دے چکے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ویزہ کی پابندی ختم کر دینی چاہیے۔ چارٹر آف ڈیموکریسی میں بھی کہا گیا ہے کہ:

Peaceful relations with India and Afghanistan will be pursued without prejudice to out sanding disputes.

اس سے دونوں دستخط کنندگان کی ترجیح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت اگرچہ بدقسمتی سے ممبئی حملوں کے المیے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کا ایک بہت برا دور چل رہا ہے لیکن پھر بھی غنیمت ہے کہ ان سطور کے تحریر کیے جانے کے وقت کشیدگی میں کمی کے کچھ آثار پیدا ہو رہے ہیں

اور امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں دونوں ملکوں کے درمیان جامع مذاکرات کا وہ عمل پھر شروع کیا جاسکے گا جو اس وقت عارضی طور پر رکا ہوا ہے اور آخر کار دونوں ملک محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اور میاں نواز شریف کے نظریات کے مطابق باہمی تعلقات قائم کرسکیں گے۔ بی بی نے اپنی شہادت سے کئی ماہ پہلے لندن میں کہا تھا کہ وہ جنوبی ایشیا کو ایک Border Less خطہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہندوستانی وزیراعظم من موہن سنگھ بھی ایک سے زائد بار کہہ چکے ہیں کہ جغرافیائی سرحدوں کی موجودگی کے باوجود ہم عملاً انھیں غیر متعلق بنا سکتے ہیں۔ یوں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان آج کے مقابلے پر بہت زیادہ کھلے اور قریبی تعلقات قائم کرنے کی خواہش دونوں طرف موجود ہے۔ میں نے جب ۱۹۶۶ء میں چودھری محمد علی صاحب سے بات کی تھی تو میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات کا خاکہ تھا لیکن چودھری صاحب کی حوصلہ شکنی کی وجہ سے میں نے پھر اس موضوع پر کافی دیر کچھ نہ لکھنے کا فیصلہ کیا لیکن اب مذکورہ کوائف کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں کوئی نئی طرح ڈالنے کی کوشش کرنا ویسا شجر ممنوعہ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ جیسا کہ بیس تیس سال پہلے تک سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر کراچی کے انگریزی معاصر کی ۲۱ر دسمبر کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر شائع ہونے والے ایک مستقل تبصرہ نگار کہتے ہیں:

The Passage of time and a legacy of mistrust and hostility leave no room to think about a loose federation now. But it should still be possible for the governments of India. Pakistan and Bangladesh to form a block or union of the hostilities of the Second World War. Evolving a common mechanism that diverts their attention and resources form the weapons of war to the poverty of their people could be the first step in that direction.

Pakistan would stand to gain more than the others because as a percentage of national income it spends twice as much on defence than India and also suffers from terrorism much more than India does. In such a collaborative arrangement 470 million Muslims of the subcontinent would count for more than they do at present, spread as they are, almost equally, over three countries.

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''وقت گزرنے اور دونوں ملکوں کے درمیان بداعتمادی اور مخالفت اس بات کی گنجائش نہیں چھوڑتے کہ اب دونوں کے درمیان ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کے سوال پر غور کیا جائے لیکن اس کے باوجود پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کے لیے یہ ممکن ہونا چاہیے کہ وہ ایک بلاک یا

ایک یونین ان خطوط پر قائم کرلیں جو جنگ عظیم دوم کی دشمنیوں کے باوجود یورپ میں رونما ہوئی۔ ایسا مشترکہ طریق کار تلاش کرنا جوان کی توجہ اور وسائل جنگی ہتھیاروں کی بجائے ان کے عوام کی غربت کی طرف مبذول کردے مذکورہ سمت میں ایک پہلا قدم ہوسکتا ہے۔ اس انتظام سے دوسروں کے مقابلے پر پاکستان کو زیادہ فائدہ ہوگا کیونکہ وہ اپنے دفاع پر اپنی قومی آمدنی کا ہندوستان کے مقابلے پر دگنا استعمال کرتا ہے اور ہندوستان سے بھی بڑھ کر دہشت گردی کا شکار بنا ہوا ہے۔ اس طرح کے تعاون پر مبنی انتظام سے برصغیر کے ۴۷۰ ملین مسلمان زیادہ اہمیت اختیار کر جائیں گے کیونکہ اس وقت وہ تقریباً مساوی تعداد میں تین ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔''

اب آیئے اس سے ایک قدم اور آگے بڑھیں۔ ایک معاصر میں لکھتے ہوئے ایک محترم دوست کہتے ہیں کہ چند ہفتے قبل مارکیٹ سے ایک کتاب آئی ہے جس کا نام ہے "The Sun Shall Rise" اور اسے لاہور کے ایک معروف اور قدیم پبلشر نے شائع کیا ہے۔ اس کے مصنف جناب عطار ربانی ہیں۔ جن کا ماضی ان کی حب الوطنی پر دلالت کرتا ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ رائل انڈین ائیر فورس میں شامل ہوگئے۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو انھیں یہ اعزاز نصیب ہوا کہ وہ قائداعظم کے پہلے ائیر ایڈی کانگ مقرر کیے گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پاکستان بنتے ہی ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت میں قائداعظم نے تین غلطیاں کیں۔ ان کا ایک بیوروکریٹ ملک غلام محمد کو ملک کا پہلا وزیرخزانہ بنانا پہلی ''غلطی'' تھی۔ اس ''غلطی'' نے آنے والے دنوں میں نوزائیدہ مملکت کو بے انتہا اور لاتعداد نقصانات پہنچائے۔ عطار ربانی کا کہنا ہے کہ حضرت قائداعظم، غلام محمد کی بجائے نواب زادہ لیاقت علی خان کو وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ وزارتِ خزانہ کا اضافی قلمدان بھی سونپ سکتے تھے کہ لیاقت علی خان کی امانت و دیانت اور پاکستان سے کمٹمنٹ اظہر من الشمس تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ملک غلام محمد کی بجائے قائداعظم کسی ایسے سیاستدان کا بھی بطور وزیرخزانہ تقرر کرسکتے تھے جس میں فنانس کے معاملات کو سمجھنے کی اہلیت ہوتی اور جسے سر رولینڈز کی نگرانی میں مزید پالش کیا جاسکتا۔ (سر رولینڈز متحدہ ہندوستان میں وائسرائے کونسل کے آخری فنانس ممبر تھے اور قائداعظم نے پاکستان کے لیے ان کی خدمات عاریتاً لے بھی رکھی تھیں) عطار ربانی کے بقول ملک غلام محمد کو نوزائیدہ پاکستان کا وزیرخزانہ بنایا جانا اس لیے بھی غیر مناسب تھا کہ ایک تو ان کے پاس خزانہ کے معاملات چلانے کا کوئی وسیع تجربہ اور علم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ انھوں نے جنگ عظیم دوم کے دوران متحدہ ہندوستان کی حکومت میں سپلائی اینڈ پرچیز کے شعبے میں چند سال گزارے تھے اور دوسرا یہ کہ ملک غلام محمد حد سے زیادہ اقتدار کا حریص تھا۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر عہدے کا متمنی رہنے والا، نہایت ضدی بیوروکریٹ اور منتقم مزاج بھی۔ اقتدار کے لیے اس کی حرص کا یہ نتیجہ نکلا کہ جلد ہی اس غیر منتخب شخص نے اقتدار کے ایوانوں میں سازشوں کا جال بچھا دیا اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے اپنا راستہ ہموار

کرنے لگا۔ یہ اس کی سازشوں ہی کا نتیجہ تھا کہ تھوڑے عرصے میں قائداعظم کی رحلت کے بعد گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی جگہ ملک غلام محمد بیٹھا تھا۔ یہ پاکستان کی بہت بڑی بدقسمتی تھی۔ چونکہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو سخت ناپسند تھا۔ اس لیے ناپسندیدہ عناصر سے گلوخلاصی کروانے کے لیے غلام محمد نے نہایت جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمنٹ میں اس کے خلاف بغاوت کے شعلے بلند ہونے لگے۔ نوزائیدہ پاکستان جسے قدم قدم پر جمہوری فیصلوں اور مشوروں کی ضرورت تھی۔ وہاں ملک غلام محمد کے فیصلوں اور اقدامات کی وجہ سے آمریت کی راہ ہموار ہونے لگی۔ عطار ربانی صاحب کا کہنا ہے کہ غلام محمد نے بلاواسطہ اور بالواسطہ حکومت سازی اور حکومت کے فیصلوں میں بیوروکریسی کو شامل کیا اور آج ہمیں سیاست میں جو آلودگی نظر آ رہی ہے وہ غلام محمد کے فیصلوں کا شاخسانہ ہے۔ غلام محمد ہی کی وجہ سے سول بیوروکریسی کے بعد ملٹری بیوروکریسی نے بھی پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے جس نے پاکستان کو دولخت بھی کیا اور تین بار ملک فوجی جرنیلوں کے قبضے میں بھی رہا۔

پاکستان آرمی کے پہلے سربراہ کو نافرمانی کی سزا نہ دینا دوسری ''غلطی'' تھی۔ اکتوبر ۴۷ء کے اواخر میں ہمارے قبائلی سری نگر ائیر پورٹ پر قبضہ کرنے کے قریب تھے۔ آس پاس کا علاقہ بھی ان کے زیر قبضہ تھا۔ ایسے میں قائداعظم نے لیفٹیننٹ جنرل ڈگلس گریسی، جنھیں عارضی طور پر پاکستان آرمی کی کمان دی گئی تھی، کو حکم دیا کہ کشمیری مجاہدین اور قبائلیوں کی اعانت کے لیے ایک بریگیڈ فوج کشمیر بھیجی جائے لیکن گریسی نے قائد کے حکم کی تعمیل کے برعکس فیلڈ مارشل آکین لیک سے رابطہ کیا جو ان دنوں بھارتی فوجوں کے سربراہ تھے اور انھیں قائداعظم کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا کہ قائداعظم فوری طور پر گریسی کو سزا دیتے ہوئے عہدے سے الگ کر دیتے اور ان کی جگہ پاکستانی فوج کے کسی سینئر افسر کا تقرر عمل میں آتا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سری نگر ائیر پورٹ بھی ہمارے قبائلیوں کی گرفت سے نکل گیا اور کشمیر کی مکمل فتح بھی ادھوری رہ گئی۔ اگر جنرل گریسی کو فوری سزا دے دی جاتی تو بعد میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تین ہلاکت خیز جنگیں ہوتیں اور نہ ہی سیاچن اور کارگل ایسی لڑائیوں کے سانحات رونما ہوتے۔ مصنف عطار ربانی نے دعویٰ کیا ہے کہ نامعلوم وجوہ کی بناء پر نہ صرف جنرل گریسی کو سزا نہ دی جا سکی بلکہ قائداعظم نے اسے لیفٹیننٹ جنرل سے ترقی دے کر فل جنرل بنا دیا اور پاکستان آرمی کے پہلے باقاعدہ سربراہ ہونے کا اعزاز بھی اسے بخش دیا۔ عطار ربانی کے دعوے کے مطابق اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینا قائداعظم کی تیسری ''غلطی'' تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت اردو بولتی تھی لیکن تقسیم ہند نے معاملات بدل دیئے۔ اب مشرقی پاکستان میں ۵۴ فیصد پاکستانی رہتے تھے جو اردو بولنا لکھنا اور پڑھنا کم کم جانتے تھے۔ ان کی زبان بنگالی تھی لیکن قائداعظم نے مارچ ۱۹۴۸ء کو مشرقی پاکستان پہنچ کر اردو کے قومی زبان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ قائداعظم نے خلوصِ نیت سے اور یکجہتی کے لیے یہ اعلان کیا تھا لیکن بنگالی پاکستانیوں نے اس فیصلے کو اپنے کلچر، روایات اور اپنی زبان کے خلاف حملہ سمجھا۔ پھر

ہنگامے شروع ہو گئے جس میں تین طلبہ بھی ہلاک ہو گئے۔ مصنف کے مطابق اس فیصلے نے پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان حائل ۱۲۰۰ میل کے آبی فاصلوں کو دل کی دوریوں میں بدل دیا۔

بہت سے لوگوں کو جناب عطا ربانی کی رائے سے اختلاف ہوگا لیکن ان کی حب الوطنی پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اب ایک اور حوالہ دیکھئے بلکہ ایک Shock کے لیے تیار ہو جایئے۔ ۲۵ر دسمبر کے ''ڈان'' میں ''ڈان نیوز'' ٹی وی کی ایک تبصرہ نگار مریم چودھری لکھتی ہیں: (وہ قائداعظم پر I remember Jinnah کے عنوان سے اپنے پروگرام کئی بار دکھا چکی ہیں)

JINNAH was a puzzle that has yet to be solved. People can tell you the most outrageous stories about the man and swear on it being honest to God truth. Or they can churn him out to be the man they fought for the right of a people who he shared a religion with? Was he a man who married for love and then lost his daughter to a land that was home and then became foreign territory? Was he a civilian with the fire of a freedom fighter or a villain with a vendetta?

میں اس اقتباس کا ترجمہ نہیں دوں گا جو خود سمجھ سکتے ہیں سمجھ لیں اور جو نہیں سمجھ سکتے بہتر ہے کہ وہ نہ ہی سمجھیں۔ مریم چودھری اپنے انگریزی اخبار کے ایک کالم نویس اردشیر کاؤس جی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

Ardshir Cowsjee a columnist who met Jinnah, was a slippery one. It was difficult to get him to express his viewpoint on the man that was without a touch of bitterness. Let's just say, whenever the subject of modern-day Pakistan came up. I had to edit a lot of what Mr. Cowsjee had to say since I knew it would not pass censorship.

اس کا ترجمہ بھی نہیں دوں گا۔ اب آیئے آگے چلیں۔

۲۸ر دسمبر کے کراچی کے ایک انگریزی معاصر میں وہی تبصرہ نگار جن کا میں پہلے حوالہ دے چکا ہوں، لکھتے ہیں:

Pakistan owes it to the Muslims of India who staked their own future on its creation not to add to their woes. It may be recalled that Partition became inevitable only when Nehru unilaterally retracted after the Congress and Muslim League had both accepted the Cabinet Mission Plan. Jinnah felt betrayed. For him then there was no going back despite lobying by Lord Mountbatten and Maulana Azad.

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان کی تخلیق کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اس لیے اب ہمیں کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جو ان کے دکھوں میں اضافے کا باعث ہو۔ یاد رہنا چاہیے کہ تقسیم ہند اس وقت ناگزیر ہوئی جب نہرو نے کابینہ مشن پلان کو اس وقت مسترد کر دیا جب مسلم لیگ اور کانگریس دونوں اسے تسلیم کر چکی تھیں۔ اس سے قائداعظم کو احساس ہوا کہ ان کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے۔ اب ان کے لیے اپنے انکار کے فیصلے سے واپس جانا ممکن نہ تھا۔ باوجود اس کے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مولانا آزاد نے انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ کابینہ مشن پلان کا استرداد ختم کر دیں۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قائداعظم کابینہ مشن پلان مسترد کرنے کے اپنے فیصلے پر قائم رہے حالانکہ اگر وہ ماؤنٹ بیٹن اور ابوالکلام کا مشورہ مان لیتے تو کابینہ مشن پلان شاید کسی شکل میں برقرار رہتا اور نہرو نے من مانی کرنے کی جو دھمکی دی تھی، ماؤنٹ بیٹن اور مولانا آزاد کو یقین تھا کہ وہ اس میں نرمی پیدا کرا سکیں گے اور کچھ ردّ و بدل بھی ممکن ہے ہو سکے گا۔ بہرکیف تقدیر کا لکھا پورا ہوا اور ہم ۱۹۴۷ء کے خون کے دریا سے گزر کر پاکستان آ گئے۔ اس ضمن میں بعض لوگوں نے کچھ مزید غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو شاید خون کی اس ہولی کو روک سکتی تھیں۔ ہندوستان میں جب عبوری کابینہ بنی تو جناب لیاقت علی خاں کے پاس وزارت خزانہ کا قلمدان تھا۔ چودھری محمد علی ان کے مشیر تھے۔ اس زمانے میں سردار پٹیل نے اپنی وزارت میں ایک چپڑاسی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ازروئے ضابطہ اس نئی تقرری کا اجازت نامہ وزارت خزانہ نے دینا تھا۔ جب ان کے پاس درخواست پہنچی تو وزارت خزانہ نے جواب دیا کہ اس نئی پوسٹ کے لیے بجٹ میں کوئی تجویز نہیں ہے۔ اس لیے اس تقرر کی منظوری نہیں دی جا سکتی اور سردار پٹیل بہت کھسیانے اور تلخ ہوئے۔ ان کی بات مان لی جاتی تو بے شک مسلمانوں کے اندر وزارتِ خزانہ کی واہ واہ نہ ہوتی لیکن عبوری کابینہ خوش اسلوبی سے چلنے کے امکانات اتنے زیادہ تاریک نہ ہوتے۔ اسی طرح جب لیاقت علی خان نے پہلا بجٹ پیش کیا تو اس میں انھوں نے ہندو سرمایہ داروں (مسلمان سرمایہ دار تو بہت کم تھے) پر بھاری ٹیکس لگائے جس سے پھر مسلمانوں میں واہ واہ ہوئی (مجھے آج تک مسلمانوں کے ردّعمل کی تفصیل یاد ہے) لیکن ظاہر ہے کہ ان بجٹ تجاویز نے ہندو سرمایہ کاروں (اور بالیں وجہ سیاستدانوں) میں بڑی تلخی پیدا کی اور یہ بھی ان عوامل میں سے ایک عامل بن گیا جس نے عبوری حکومت کے تجربے کو تلخ بنا دیا۔ اگر یہ تلخ تجربہ یا تجربات نہ ہوئے ہوتے تو کانگریسی قیادت کابینہ مشن پلان کی نامنظوری تک شاید نہ جاتی لیکن قدرت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ آج کی پاک ہند قیادت کو ان واقعات سے سبق سیکھنا چاہیے اور اب بھی کسی قسم کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔ میں آج بھی جب کابینہ مشن پلان کی ناکامی پر غور کرتا ہوں تو میرا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ ممتاز پاکستانی سکالر اور مؤرخ ڈاکٹر عائشہ جلال کی بھی یہی رائے ہے جو اسلام آباد سے لندن کے ایک سفر کے دوران اگست

۲۰۰۲ء میں انھوں نے میرے سامنے ظاہر کی۔ سیفما نے کئی ماہ پہلے لاہور میں ساؤتھ ایشیائی صحافیوں کی ایک کانفرنس بلائی تھی جس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا: ''ماضی میں ہم دونوں سے جو بھی غلطیاں ہوئیں اب تاریخ کی قوتیں ہمیں دھکیل رہی ہیں کہ ہم ہوش مندی اور تعاون باہمی کا راستہ اختیار کریں۔'' میرے اس تبصرے پر پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے صحافیوں نے اطمینان کا اظہار کیا تھا اور جناب ایم جے اکبر نے تو کہا تھا کہ آپ نے بہت دانائی کی باتیں کی ہیں۔ ممبئی کے حالیہ واقعے اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والے خدشات کے بعد تو پاک ہند تعاون کی ضرورت مزید واضح ہوگئی ہے۔ کیا دونوں طرف کوئی سننے والا ہے؟

یوں آپ دیکھیں گے کہ میں نے ۴۰ سال پہلے ۱۹۶۶ء میں چودھری محمد علی کے سامنے جو تجویز پیش کی تھی آج کی پاکستانی قیادت اس کی افادیت کو محسوس کر رہی ہے۔ جناب مصطفیٰ صادق دو دفعہ مجھے تصدیق کر چکے ہیں کہ انھیں یہ ملاقات اور گفتگو یاد ہے۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن امر واقع یہ ہے کہ جب میں نے یہ تجویز پیش کی تھی تو میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو ابھی سیاست کے میدان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ قریباً ۳۰ سال پہلے سیاست میں آئے تھے۔

تیسرا واقعہ:

مخدوم امین فہیم کی صاحبزادی کی آئرلینڈ میں بطور فرسٹ سیکرٹری تقرری تمام ضابطوں کو نظر انداز کر کے کی گئی۔ اس سے پہلے فرح حمید ڈوگر کا کیس سامنے آیا تھا جس پر حکومت ابھی اصلاحِ احوال کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔ اب ایک تیسرا ایسا ہی واقعہ سامنے آیا ہے۔ وزیر قانون جناب فاروق ایچ نائیک کی صاحبزادی مشعل کو سٹیٹ بینک میں ایک بڑے عہدے پر فائز کر دیا گیا ہے۔ سٹیٹ بینک نے اس تقرر کا جواز ایک طول طویل پریس ریلیز میں بیان کیا ہے جو کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ جس طرح امین فہیم کی بیٹی کو بہت سے اہل اور میرٹ پر منتخب امیدواروں پر برتری دی گئی تھی اسی طرح نائیک صاحب کی صاحبزادی کو بھی بہت سے اہل اور ٹریننگ لینے والے امیدواروں پر سبقت دی گئی ہے۔ ٹریننگ لینے والے امیدواروں کو تقرری پر قریباً ۲۵ ہزار روپیہ تنخواہ ملتی ہے لیکن مشعل بیٹی کو آغاز کار ہی میں ۵۰ ہزار روپیہ تنخواہ دی گئی ہے۔ وہ یقیناً اہل اور لائق ہوگی لیکن سٹیٹ بینک کی ملازمت میں داخل ہونے کا ایک طریق کار ہے جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مخدوم صاحب، ڈوگر صاحب اور نائیک صاحب تینوں اس رسول اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والے ہیں جنھوں نے ایک بڑے گھر کی عورت کو چوری کرنے پر قطع ید کی سزا دی تھی اور جب طاقتور لوگوں نے اس کی سفارش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اسے بھی یہی سزا دیتا۔ تم سے پہلی امتیں بھی اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ وہ کمزوروں کو پکڑتی تھیں اور طاقتوروں کو چھوڑ دیتی تھیں۔'' ہمارے مذکورہ تینوں اکابر ایک لمحے کے لیے اپنے اپنے گریبان میں جھانک لیں تو ان کے لیے اور ملک کے لیے بھی اچھا ہوگا۔ [روزنامہ ''جنگ'' ۳ تا ۶ جنوری ۲۰۰۹ء]